www.alkalam.pk

... نئی زندگی ...

بنت اسلام

سرسراہٹ کی آواز نے دادا ابو کو چونکا دیا۔ وہ ابھی اپنی کرسی سے اٹھے ہی تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے فوراً دروازے کی طرف دیکھا تو مسکرا کر رہ گئے۔ ننھی سویرا سہمی سی کھڑی تھی۔

”ارے بیٹا رانی! ابھی تک سوئی نہیں آپ؟“ انہوں نے پیار سے پوچھا۔

”نہیں دادا ابو! وہ! وہ! ابھی تو! آپ سے۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

دادا ابو نے عینک کے اوپر سے اسے گھورتے ہوئے کہا:

”اچھا! اچھا سمجھ گیا، چلو جاؤ! باقی بچوں کو بھی بلا لاؤ، ورنہ تم لوگ سونے نہیں دو گے۔ بار بار دروازہ کھولو گے اور بند کرو گے۔“

یہ سنتے ہی وہ کلی کی طرح کھل گئی اور کسی تتلی کی مانند اڑتی چلی گئی۔

اب سب بچے دادا ابو کے بستر کے اوپر ان کے اردگرد بیٹھ گئے تھے۔ کسی نے چاپلوسی سے پاؤں دبانا شروع کر دیے تو کسی نے بازو... اور دادا ابو خوشی سے مسکراتے ہوئے ان کے معصوم چہروں میں کھو گئے۔

اچانک حذیفہ کی آواز نے انہیں واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا:

”دادا ابو! اب شروع بھی کیجیے ناں کہانی۔ کیا بس ہمیں دیکھنے کے لیے ہی بلایا ہے!“

اوران کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

''نالائق میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں آج اپنی زندگی کا سچا اور حیرت انگیز واقعہ نہ سنا دوں!''

''اچھا! دادا ابو! اب سمجھے، ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید میں حسین ہی اتنا ہوں کہ دادا ابو مجھے ہی دیکھے جا رہے ہیں۔'' اب کی بار سعد نے زبان کھولی۔ دادا ابو کھلکھلا کے ہنس دیے۔ پھر ٹیک لگاتے ہوئے بولے: ''اچھا! سنو! اس سے پہلے کہ بہو رانی تم لوگوں کو سونے کے لیے بلانے آجائے میں اپنی زندگی کا ایسا واقعہ سناتا ہوں جس نے مجھے نئی زندگی بخشی۔'' بڑے دلچسپ انداز میں وہ گویا ہوئے۔

''نئی زندگی...!'' سویرا منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''ہاں بیٹا رانی! نئی زندگی کا مطلب ہے کہ اللہ نے مجھے موت یعنی کہ مرنے سے بچالیا، ورنہ آج میں تمہارے بجائے اللہ میاں کے پاس ہوتا۔''

''جی! جی! جی! جی!'' سویرا نے حیرت سے جی کو لمبا کیا۔

''جی ہاں!'' دادا ابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بچو! اب درمیان میں بولنا نہیں، ورنہ بندہ کہانی بھول جاتا ہے۔''

''مگر دادا ابو! آپ نے تو کہا ہے، یہ سچا واقعہ ہے جو آپ کو پیش آیا۔ کیا سچا واقعہ بھی درمیان سے بھول سکتا ہے!'' حذیفہ نے جلدی جلدی کہا۔

''اچھا! اچھا! عقل کے بادشاہوں معافی چاہتا ہوں، اب شروع کروں؟'' انہوں نے ٹیک چھوڑتے ہوئے کہا۔

’’جی !جی !ضرور۔‘‘سعد نے زبان کھولی۔

’’تو ہوا یوں کہ ایک دفعہ ہم لوگ اپنی جوانی کے زمانے میں مچھلیوں کے شکار پر نکلے۔اُن دنوں ہم گاؤں ہری پور میں رہا کرتے تھے۔میرے ساتھ میرا دوست گاما ماچھی بھی تھا۔گرمیاں پورے جوبن پر تھیں،اس لیے نہر کا کافی حصہ سوکھ چکا تھا،یعنی کہ وہ کیچڑ سا تھا جس میں مچھلیاں کافی نیچے چلی جاتی ہیں مگر سانس لینے کے لیے اوپر سوراخ سا بنا جاتی ہیں۔ہم ان سوراخوں کے منہ پر بیٹھ کر اپنی مشکوں سے ان میں پانی انڈیلتے تھے،جیسے ہی سوراخ پانی سے بھرنا شروع ہوتا، مچھلی سانس لینے کی غرض سے اوپر آنا شروع کر دیتی۔ہم فوراً اسے دبوچ لیتے۔اس دن بھی ہم نے ایسا ہی کیا۔گاما ماچھی مجھ سے کافی دور ایک سوراخ پر جا بیٹھا اور میں نے بھی ایک سوراخ کیچڑ میں سے ڈھونڈ کر اس میں پانی ڈالنا شروع کر دیا اور چوکس ہو کر بیٹھ گیا کہ جیسے ہی مچھلی منہ باہر نکالے گی،میں اسے منہ سے پکڑ لوں گا۔جیسے ہی سوراخ بھرنے کے قریب ہوا،اندر سے تھوڑا سا سر جان دار کا نمودار ہوا۔میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ،جلدی سے اسے منہ سے دبوچ لیا اور باہر کی طرف کھینچا۔

مگر !یہ کیا؟ اگلے ہی لمحے میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور جسم کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ حذیفہ نے بے قراری سے کہا۔

دادا ابو نے سنسنی خیز انداز میں اُس کی طرف دیکھا اور کہا’’ کیونکہ میرے ہاتھ میں مچھلی کے بجائے بہت طاقت ور سانپ تھا۔‘‘

''کیا؟'' بچے خوف کے مارے چلّا اٹھے۔

دادا ابو نے ان کو اپنے سے قریب کرتے ہوئے کہا:

''ہاں! سانپ۔ چونکہ میں نے اسے سر سے دبوچ رکھا تھا، اس لیے وہ اپنا منہ نہیں کھول سکتا تھا۔ مگر اب مرتا کیا نہ کرتا، میں اسے چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی پکڑے رکھ سکتا تھا۔ میں نے سوچا اسے گردن سے دبوچا تو ہوا ہی ہے، چلو ذرا زور لگا کر اس کا گلا ہی دبا دیتا ہوں۔ اُن دنوں جوانی بھی اپنے عروج پر تھی اور میں بہت طاقت ور تھا۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''پھر! پھر! پھر! کیا ہوا؟'' سعد نے جلدی سے کہا۔

اور دادا ابو نے دوبارہ کہانی کا تانا بانا جوڑا: ''پھر میں نے اس کی سری پر زور ڈالا مگر اگلا ہی لمحہ مجھے لرزا دینے والا تھا۔ سانپ کوئی چھ سات فٹ کا تھا۔ اس نے نچلے دھڑ کو جھٹکا دیا مگر میں نے بھی اپنی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی۔

جھٹکا دینے کے ساتھ ہی وہ میرے اسی بازو سے رسّی کی طرح لپٹ گیا۔

تب مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث شدت سے یاد آئی کہ ''سانپ اور بچھو انسان کے دشمن ہیں، انہیں جہاں دیکھو ماردو''۔ مگر میں اسے مارتا تو کیسے؟ یہ کمبخت سانپ میری جان لینے پر تلا ہوا تھا۔ میرا دوست بے چارگی کے عالم میں مجھ سے کچھ دور کھڑا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر پا رہا تھا اور اس کے چہرے پر میری طرح ہی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سانپ نے اپنے بلوں کو مزید کسنا شروع کیا تو میری دلخراش چیخوں نے آس پاس کے سب مچھیروں کو

میرے اردگرد اکٹھا کر دیا۔ ہر کوئی حیران و پریشان تھا اور دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا۔ میں پھنسا ہی ایسا تھا کہ کوئی کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ جلد ہی میری ساری طاقت جواب دے جائے گی اور میں سانپ کا تر نوالہ بن جاؤں گا۔

خوف و ہراس کی وجہ سے مجھے بے ہوشی سی طاری ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگایا اور اپنی ساری قوت یکجا کرتے ہوئے اس کی گردن پر زور ڈالا، مگر بے سود! کیونکہ میرا وہی بازو اس کی گرفت میں تھا، زور کیسے لگاتا؟ میرے نعرے اور چیخیں سن کر قریبی بستی سے ایک شخص بھاگتا ہوا میرے قریب آیا اور چلّا کر کہا:

''اے نوجوان! جلدی کرو، ہمت نہ چھوڑنا۔ بھاگ کر قریبی ہائی وے پر چڑھو اور اس نامراد کا منہ پوری قوت سے سڑک پر رگڑ دو۔'' اس کی بات سنتے ہی مجھ میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ میں بھاگ کر سر کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ہائی وے پر چڑھا اور دوسرے ہاتھ سے بھی مدد لیتے ہوئے اس کا سر پوری قوت سے سڑک پر رگڑنے لگا۔ غصے اور جوانی کے جوش میں اتنی شدت سے میں نے اس کا سر رگڑا کہ وہ لہولہان ہو گیا اور اس کی گرفت بھی میرے بازو پر ڈھیلی ہو گئی۔ میں نے جلدی سے دوسرے ہاتھ سے اس کے نچلے دھڑ کو اتارا اور سانپ جو اَدھ موا ہو چکا تھا، اپنے سے دور پھینک دیا۔

ساری بستی ''اللہ اکبر'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔ میرا دوست اور وہی بستی والا شخص دوڑ کر میرے پاس آ گئے، کیونکہ اس کا منہ رگڑتے ہوئے میرا ہاتھ بھی کافی چھل گیا تھا۔ انہوں نے پانی سے میرا ہاتھ دھویا اور مرہم پٹی کی۔ میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ باقی لوگوں نے اس اَدھ

موذی سانپ کو ڈنڈوں کے وار کرکے مکمل طور پر مار دیا۔

میں چاہتے ہوئے بھی سڑک پر سے کئی گھنٹوں تک اٹھ نہ سکا اور سڑک پر ہی اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگیا، اور بچوں کی طرح بلک بلک کر ''نئی زندگی'' ملنے پر رو پڑا۔ سب لوگوں نے مجھے تسلی دی، پیار کیا۔ بستی سے بوڑھی عورتیں بھی آگئی تھیں جو میرا ماتھا چوم رہی تھیں۔

دادا ابو نے یہ کہتے ہوئے ہماری طرف دیکھا تو ہماری آنکھوں میں بھی آنسو آچکے تھے۔

''ارے! یہ کیا؟'' انہوں نے یہ کہتے ہوئے اپنی باہیں پھیلا دیں اور وہ تینوں ان میں سمٹ گئے۔

''نالائقو! اتنے بہادر دادا ابو کے پوتے اور پوتی ہو کر رو رہے ہو! اسی لیے تو آج تک میں نے یہ واقعہ تم لوگوں کو سنایا نہیں تھا۔'' انہوں نے بچوں کو سینے سے الگ کرتے اور ان کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''دادا ابو! اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو!'' سویرا نے روہانسی آواز میں کہا۔

بے اختیار انہوں نے دوبارہ اسے سینے سے لگا لیا۔

''میری جان! اسی لیے تو اللہ نے بچا لیا کہ سویرا دادا کہاں سے لے گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دیے۔ انہیں مسکراتا دیکھ کر باقی بچے بھی مسکرا دیے۔

اسی لمحے، کمرے کا ادھ کھلا دروازہ مزید کھلا اور بہو رانی پلو سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اندر داخل ہوئیں اور دادا ابو کی طرف ''نم'' آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا:

”اسی لیے تو ابا جان کہتے ہیں، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ چلو بچو! اٹھو، صبح اسکول بھی جانا ہے، اب سو جاؤ۔“

تینوں بچے نہ چاہتے ہوئے بھی دادا ابو کو سلام کرتے ہوئے اپنی ماں کے ساتھ چل دیے۔

(بشکریہ: روزنامہ جسارت)

(Jasarat Magazine, November 11, 2012)

پیشکش: ابوزبیر

[www_alkalam_pk@yahoo.com]